© rasailojaraid.com

سید سلیمان ندوی شاعر کی حیثیت سے

از ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اعظم گڑھ

(۲)

تیسرا دور، "روحانی سفرنامہ" سید صاحب کی شاعری کے تیسرے اور آخری دور کا کلام کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے مستقل عنوان کا مستحق ہے۔ اس میں انھوں نے علم کی اقلیم سے نکل کر آسمانِ معرفت کی سیر اور بادہ وساغر کے پردے میں "مشاہدۂ حق" کی گفتگو کی ہے۔ سید صاحب کا دورِ آخر کا یہ کلام تمام تر عارفانہ اور متصوفانہ رنگ میں ہے۔ اس رنگ کا آغاز مولانا تھانوی کی ارادت سے کچھ پہلے ہوا۔ اور ان کی حلقہ بگوشی پر عروج و کمال کو پہونچا۔ اس سے پہلے سید صاحب کا مشغلۂ سخن محض تفریحِ خاطر اور تفننِ طبع کے لئے جاری تھا۔ اس لئے اس میں موزونیِ طبع اور قادر الکلامی تو ملتی ہے مگر "از دل خیزد بر دل ریزد" والی کیفیت معدوم ہے۔ لیکن آستانہ اشرفی سے تعلق کے بعد ان کے جذبات شوق میں جو شدت اور وفور پیدا ہوا وہ زبان سے شعر و نغمہ بن کر ابلنے لگا

اس زمانہ کے مقرب عینی شاہدین کا بیان ہے کہ ارادت کے بعد سید صاحب میں اتنا غیر معمولی تغیر ہو گیا کہ وہ ہر مجلس میں بلکہ ہر وقت نغمہ خوانی کرتے رہتے تھے جبکہ اس سے پہلے یہ حالت نہ تھی[1] جذبات کی شدت و فراوانی اور اشعار کی کثرتِ آمد کا یہ عالم تھا کہ کبھی ایک دن میں کئی کئی غزلیں موزوں ہو جاتی تھیں۔ جب کسی مجلس میں وہ عارفانہ اشعار پڑھتے تھے تو سامعین کو تڑپا دیتے تھے۔ اس عہد کے وفورِ جذبات کے بارے میں غلام محمد نے خود سید صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

---

[1] سید حسین: حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۳۲۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

" میری اس دور کی شاعری کا آغاز حضرت والا (تھانوی قدس سرہٗ) کے تعلق سے ہوا، اور انجام بھی حضرت کی رحلت ہی پر ہوگیا۔ بعد میں مشکل سے دو چار غزلیں ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت کی موجودگی میں جذبات کا وفور رہتا تھا۔ جو پھر باقی نہیں رہا" (تذکرۂ سلیمان ص ۱۲۲)

سید صاحب نے اپنے عارفانہ کلام کے مجموعہ کا نام "غزل الغزلات" خود تجویز کیا تھا۔ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لاہوتی نغمات کا عنوان تھا[1] اس اشتراکِ رسمی سے فائدہ اٹھانا ان کے حسن ذوق کا بین ثبوت ہے۔ لفظی اور معنوی دونوں خوبیوں کے اعتبار سے یہ کلام اس نام کا مستحق ہے۔ غزل الغزلات کو سید صاحب اپنا "روحانی سفرنامہ" کہا کرتے تھے۔ اور فی الواقع اس میں راہ سلوک و معرفت کے ہر مرحلہ کے نشانات ملتے ہیں[2]۔ ارمغانِ سلیمان کا یہ حصہ انتالیس[39] غزلیات، تین قطعات اور ایک فرد پر مشتمل ہے۔ اور ہر ایک کے خاتمہ پر تاریخ اور مقامِ تحریر درج ہے۔ کل اشعار کی مجموعی تعداد ۳۱۶ ہے۔ ان اشعار سے شاعر کے روحانی ارتقاء اور عارفانہ مشاہدات کی تفصیل بخوبی معلوم ہوجاتی ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی رقمطراز ہیں۔

" اس دور کا کلام تمام تر قلبی واردات کا ترجمان اور بادۂ عرفان کا چھلکتا ہوا جام ہے۔ اس میں طور کی تجلیاں اور وادی ایمن کی شرر باریاں نظر آتی ہیں"[3]

سید صاحب نے اپنے اشعار میں معرفت اور تصوف کے مسائل کو محض روایتی طور پر نظم نہیں کیا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے۔ سید صاحب بادۂ تصوف اور مئے عرفان سے سرمست و سرشار تھے۔ اور انھوں نے اپنے "واردات عشق" اور "سفر معرفت" کی روداد ہی کو شعر کے قالب میں پیش کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے

---

[1] غلام محمد : ارمغان سلیمان، مقدمہ ص ۹

[2] شاہ معین الدین: مضمون "ارمغان سلیمان" معارف جولائی ۷۱ء ص ۴۱

[3] مصدر سابق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ اس عہد کے کلام میں انھوں نے محض موزونیٔ طبع اور ندرت بیان کا کرشمہ نہیں دکھایا ہے بلکہ ان کی زندگی اور شخصیت سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں
سب واردات عشق رقم کر رہا ہوں میں

فیض ہے یہ کس ولی وقت کا
اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

اردو شاعری میں دوسری بہت سی روایات کی طرح تصوف کی روایت بھی فارسی شاعری کے زیر اثر آئی۔ "فارسی شاعری نے تصوف کی شراب کو اپنے پیمانوں میں اتنا رچایا، بسایا اور چھلکایا کہ وہ ایک طرف معرفت وسلوک کا نشہ بن کر چھکی۔ دوسری طرف عشق مجازی کی رگوں میں خون بن کر دوڑی۔ اور تیسری طرف انسان دوستی کا وہ لہو بنی جو رگوں میں دوڑنے، پھرنے کے ساتھ ساتھ سینہ سنگ میں شرر بن کر تڑپا"۔ یوں تو یہ روایت اردو شاعری میں ہمیشہ پروان چڑھتی رہی۔ لیکن صاحبان دل شعراء نے اُس کو واردات دل کی زندہ تصویر بنا دیا۔ اور توحید و معرفت کے تمام راز پردۂ شعر میں فاش کئے۔ دکن میں شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ گیسو دراز میراں جی شمس العشاق اور شاہ صبغت اللہ کے خانوادہ تصوف نے شعر وادب پر بلاشبہ بہت گہرے نقوش چھوڑے۔ اور تصوف کا اثر عام زندگی پر اتنا مضبوط ہو گیا کہ اس عہد کے وہ شعراء بھی جو صاحب معرفت نہیں کہلائے جا سکتے۔ کسی نہ کسی درجہ میں تصوف کا رنگ قبول کرنے پر مجبور رہے۔ پھر جب ولی نے دلی پہونچکر اردو شاعری کا صور پھونکا تو وہ خود چونکہ شاہ گلشن کے حلقہ بگوش تھے اس لئے انھوں نے بادۂ عرفاں کے چھلکتے ہوئے جام سے ہر نفس کو شاد کام کیا۔ اور پھر اس کی روایت اتنی مقبول عام ہوئی کہ جو شعراء صوفی نہ تھے، انھوں نے تصوف کو "برائے شعر گفتن خوب" قرار دے کر رسم زمانہ کے مطابق مسائل تصوف کو جامۂ شعر پہنانا ضروری خیال کیا۔

لیکن اردو شاعری کے اس روایتی تصوف سے قطع نظر ایسے شعراء کے نام محض انگلیوں پہ

۵؎ وحید اختر: خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری ص ۲۹۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گنے جاسکتے ہیں جنھوں نے رسمًا نہیں بلکہ محرم راز ہوکر مسائل تصوف کی ترجمانی کی ہے اور جو خود مئے معرفت کے لذت شناس، عارف باللہ اور سالک راہِ طریقت تھے۔ ان شعراء نے اپنے کلام میں تصوف کے جن اسرار و رموز کا گنجینہ پیش کیا اور جس طرح اس کو گلہائے معرفت سے سجایا ہے وہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کا صحیح مصداق ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:۔

"یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دورِ قدیم میں جن شعراء کے کلام میں صوفیانہ جذبات ملتے ہیں وہ خود بھی حقیقی معنوں میں صوفی اور عارف باللہ تھے[1]۔"

ایسے گنتی کے شعراء میں ولی، مرزا مظہر جانجاناں، میر درد، آتش، نیاز بریلوی، آسی غازیپوری، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کے نام نمایاں ہیں۔ جن کے ذوقِ سخن کی آبیاری یا تو تصوف کے سرچشمہ سے ہوئی یا پھر وہ زندگی کے کسی مرحلہ میں اس کی لذت سے آشنا ہوئے خصوصًا خواجہ میر درد نے جس طرح معرفت و سلوک کے مضامین کو شاعری میں سمویا ہے اس کی مثال کم از کم اردو شاعری میں مفقود ہے۔ بلا شبہ ان کا اردو کلام بادۂ عرفان سے لبریز ہے[2]۔ انھوں نے بقول آزاد "چھوٹی بحر کی غزلوں میں گویا تلوار کی آبداری نشتر میں بھر دی ہے[3]" اسی لئے ڈاکٹر اعجاز حسین نے انھیں صوفیانہ شاعری کا سرتاج قرار دیا ہے[4]۔

اوپر جن معدودے چند صاحبانِ دل اور سالکانِ طریقت اردو شعر کا ذکر ہوا، علامہ سید سلیمان ندوی کا عہد آخر کا کلام انھیں بھی اسی صف میں جگہ دلاتا ہے۔ لیکن راقم سطور کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سید صاحب کا شاعرانہ مرتبہ میر درد، آتش یا حسرت و اصغر کے برابر ہے۔ بلکہ غرض صرف یہ کرنا ہے کہ "غزل الغزلات" کے اشعار تمام تر دروں بینی، داخلیت اور حقیقی خیالات و احساسات کا شاہکار ہیں۔ اسی باعث وہ خود کہتے ہیں [5]

---

[1] اعجاز حسین آئینۂ معرفت ص ۱۲۸۔

[2] وحید اختر: خواجہ میر درد تصوف اور شاعری ص ۳۱۰

[3] محمد حسین آزاد: آبِ حیات ص ۱۸۹

[4] اعجاز حسین : آئینۂ معرفت ص ۲۳۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں — مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

اب ذیل میں اس "روحانی سفرنامہ" کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔ تصوف کا دارو مدار عشق پر ہے۔ بغیر اس کے منزلِ مقصود تک پہونچنا محال ہے۔ بالخصوص چشتیہ عالیہ سلسلہ میں تو اول و آخر بس عشق ہی عشق ہے۔ اس لئے سید صاحب کی روح بھی وادئ سلوک و معرفت میں آکر سوز و گداز عشق اور وجد و کیف سے معمور ہو گئی ہے۔ اور پھر ان کی روح کے تار پر جو زخمہ بھی لگا وہ زبان کا نالہ یا دل کا نغمہ بن گیا۔ خود ہی کہتے ہیں ؎

نغمۂ اللہ سے طبعِ حزیں موزوں ہوئی — جو کبھی گاتی نہ تھی وہ وجد میں گانے لگی

سید صاحب کے عارفانہ اشعار میں بھی عشقِ مجاز کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے مرشد اور محبوبِ حقیقی کو بھی مجازی محبوب تصور کرکے ان سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے — ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو — دوری مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں

سجدے میں رکھ کے سر ترے پائے خیال پر — تعمیر اک بہشتِ ارم کر رہا ہوں میں
کہہ کہہ کے دل فریب، دل آرا و دل نشیں — تردید قصہ ہائے ستم کر رہا ہوں میں

معلوم نہیں کس دم، فرمائیں مجھے وہ یاد — ناآن کا نہ ہوا ہے دل، اک لمحہ فراموش
حاصل ہے تصور میں کیفیت معراج — کیا کیا نہ مزہ پایا، پایا جو ہم آغوش

یاد ان کی دم بدم آتی نہیں — کیا مزاجِ یار برہم ہو گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گاہ دیکھا تھا مری چشمِ تصور نے تمہیں اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

دل ہے اے ناداں تجلی گاہِ دوست کیوں نگاہِ شوق سوئے بام ہے

مرشد سے کمال محبت، اس کی خانقاہ کے در و دیوار سے عقیدت، شیخ کی محفل اور "چشمِ ساقی" کے اثرات کے بے حد دلکش مرقعے "غزل الغزلات" کے ہر ورق پر ورقِ گُل کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ عارفانہ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ہر چیز میں جس کی ہے کیفیت مستانہ آباد رہے یا رب تا حشر وہ مے خانہ
زاہد نے کہاں پائی، زاہد نے کہاں پی لی گفتار رہے رندانہ، رفتار رہے مستانہ
حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی آ دل میں مرے چھپ جا اے صورتِ جانانہ
ذرہ ذرہ عالمِ محسوس کا خاموش ہے یار ہے گرمِ سخن محفل سراپا گوش ہے
چشمِ ساقی میں بھری کیا بادۂ پُر جوش ہے جس طرف آنکھ اُٹھ گئی وہ مست ہے مدہوش ہے
کیا بھری تاثیر ہے مطرب تیری آواز ہے جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے
نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا تن میں جیسے روحِ بسمل مائلِ پرواز ہے
حیات نو مجھے اس کی نگاہِ ناز نے بخشی بھرا ہے آبِ حیواں کاسۂ زہرِ ہلاہل میں
جو موسیٰ ہوں تو بھی اتباعِ خضر لازم ہے ہدایت منحصر ہے اتباعِ شیخِ کامل میں

دل کے انوار و تجلیات سے معمور ہو جانے کے بعد خارجی دنیا کے تمام مظاہر اور سرمایۂ خرد، ہیچ نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ برسوں کی محنتِ شاقہ کے بعد ہوش و خرد کا جو خرمن جمع کیا تھا اس کو بھی آگ لگانے کو تیار ہو گئے۔

میرے ہوش و خرد نے جمع جو کیا برسوں لگا دے برقِ ایمن آگ تو اس میرے حاصل کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساقی میخانہ سے نہایت مستی اور سرشاری کے ساتھ مخاطب ہیں ؎

تیرے ایک چھینٹے سے اے ابر بہاری ان دنوں — سبز ہے، شاداب ہے، سیراب ہے گلزارِ دل
دور ہوتی جا رہی ہے ہر کھٹک جو دل میں تھی — تیرے سوزن سے نکلتے جا رہے ہیں خارِ دل
عشق کا رہبر دلیلِ راہ جس دن سے بنا — بن رہا ہے آپ ہی انکارِ دل، اقرارِ دل
ہوش ہے، گرمی و مستی ہے، وفورِ شوق ہے — شکر ہے، رونق پہ ہے، امروز کا دربارِ دل

مہر و محبت سید صاحب کی شخصیت کے فطری جوہر تھے۔ ارادت کے بعد یہ جذبہ معرفت کی بھٹی میں تپ کر اور بھی کندن بن گیا ہے۔ کیوں کہ صوفیانہ شاعری میں عشق و محبت کا تصور ارضی و جسمانی محبت سے آگے بڑھکر ایک پاکیزہ اور ارفع و اعلیٰ عنصر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تصورِ محبت کے زمزمے سید صاحب کی عہدِ آخر کی غزلوں میں بکثرت سامعہ نواز ہوتے ہیں۔ ان کی دنیائے محبت میں افلاک کی وسعت تھی۔ اور وہ اس کو "کونین کی دولت" اور "آبِ حیات" سمجھتے تھے۔ اور "اندوہِ محبت" کو "گنجینۂ عشرت" خیال کرتے تھے ؎

اس فقر میں بھی عاشق کیا صاحب دولت ہے — اک ذرۂ محبت کا کونین کی دولت ہے
آباد ہے اک عالم ہر گوشۂ خاطر میں — دنیائے محبت میں افلاک کی وسعت ہے
اک گھونٹ میں بھولا ہے میخوارِ دو عالم کو — کیا تند نشہ تیرا اے جامِ محبت ہے

ترے نام ہی میں حلاوت ملے — جو ذوقِ محبت کی دولت ملے
محبت تو اے دل بڑی بات ہے — یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے
یہی زندگی جاودانی بنے — جو آبِ حیاتِ محبت ملے

کشش پر ہے قائم نظامِ وجود — یہ گھر اک محبت سے معمور ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اک غم نے بنایا ہے ہر غم سے مجھے فارغ اندوہِ محبت بھی گنجینۂ عشرت ہے

کثرتِ ذکر سے جب رگ و پے میں حق ہی حق سرایت کر جاتا ہے تو ہر چیز میں حق کا ظہور اور ہر آواز میں حق کی پکار محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور ہر موئے بدن سازِ حقیقت بن جاتا ہے صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو "سلطان الاذکار" کہتے ہیں۔

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز ہر رگِ جاں سازِ الّا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں ہر صدا آوازِ الّا اللہ ہے
ہے اسی کی سانس انفاسِ حیات جو کوئی دمسازِ الّا اللہ ہے
دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند قلب ذکر سازِ الّا اللہ ہے
وجد میں جاں ہے تو اعضا رقص میں جامِ مئے آوازِ الّا اللہ ہے

۱۹۴۹ء میں سید صاحب آخری بار سفرِ حج کے لئے مکہ معظمہ پہونچے تو اس ارضِ قدس پر قدم رکھتے ہی ان کے ذوق و شوق کے سمندر میں طغیانی آگئی اور اس عالم میں ایک نہایت والہانہ غزل کہی، جس کے اوپر اپنے قلم سے "بوقت حاضری مکہ معظمہ" تحریر کیا ہے۔ نمونہ کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

دیدہ و دل اگر ہو باز، راز رہے نہ راز میں جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں
ان کے کرم کے ہم نثار، ان کی عطا کا کیا شمار دید با عاصیوں کو بار اپنے حریمِ ناز میں
دل کو نصیب ہو گداز، جاں کو عطا ہو سوز و ساز ہے یہ دعا بصد نیاز در گہِ بے نیاز میں

وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو درج ذیل قطعہ میں کس کیفیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ قطعہ "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کی تفسیر اور سید صاحب کے "سیر الی اللہ" کے آئینہ دار ہے ؎

جہاں تو مجھیں وہیں پائیں جہاں ڈھونڈھیں وہیں تو ہے تجھے جو یاد کرتا ہے اسی کا ہم نشیں تو ہے
تری ہی روشنی ہر چار سو پھیلی ہے عالم میں کہیں بھر فلک تو ہے کہیں زیر زمیں تو ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی زمانے میں انھوں نے فارسی میں ایک الہامی غزل کہی۔ اس کے نیچے ایک گوشہ میں "بوقت خاص" مرقوم ہے۔ اس اشارہ کی رمز کشائی کرتے ہوئے وہ خود فرماتے ہیں کہ "انیسویں شب رمضان کو نمازِ تہجد پڑھکر ذکر کیلئے بیٹھا ہی تھا کہ دفعتہً یہ پوری غزل قلب پر وارد ہوئی فارسی میں میری صرف یہی ایک غزل ہے"[1] اس مرصع غزل کو دیکھ کر ایک سخن سنج نے کہا کہ "اس پر تو عراقی کے کلام کا گمان ہوتا ہے"[2] چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

شیوۂ صد زبونم آرزوست — سینۂ آغشتہ بخونم آرزوست
گوش می جوید پیام از وصل دوست — ارجعی در راجعونم آرزوست
خوش نمی آید سجودِ بے حضور — فی صلوٰۃ حاشعونم آرزوست
از حصار این وآں بیروں کشد — آن نگاہِ پُر فسونم آرزوست
خبر من ہست آنچہ تو فرمودہ — آنچہ فرمودی ہمونم آرزوست

وجدانی کوائف اور عارفانہ معارف و حقائق سے معمور چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

سما جا مرے دل میں ارماں ہو کر — دوئی دور کردے مری جاں ہو کر
تصوّر میں کیا کیا عنایت ہے ان کی — مرے گھر میں آئے ہیں مہماں ہو کر

دلِ حریف نگہِ یار کہاں سے لاؤں — جو نہ بیخود ہو وہ ہشیار کہاں سے لاؤں
قطرۂ اشک میں ہوں دل کے بھی ٹکڑے شامل — نظرت دیدۂ خوں بار کہاں سے لاؤں

ذکرِ حق سے صیقل کامل ہوا — محو دل سے نقش ہر باطل ہوا
دیکھ کر سب کو اسی کو چن لیا — جو نگاہِ ناز کے قابل ہوا

مولانا تھانوی کی وفات (جولائی ۱۹۴۳ء) کے بعد سید سلیمان ندوی کا چشمۂ سخن بالکل

---

[1] غلام محمد: تذکرۂ سلیمان ص ۳۵۳ [2] مصدر سابق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خشک ہوگیا اور شاعرانہ جذبات مسدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بعد دس سال کی طویل مدت میں انھوں نے صرف دو نعتیں اور سات آٹھ غزلیں کہیں۔ لیکن جو جذباتی ہیجان ارادت کے بعد ان میں پیدا ہوا تھا اس کا جلوہ پھر تادمِ واپسیں نظر نہ آسکا۔

سید صاحب کا اس دور کا کلام بظاہر سلیس اور آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت معنوی اعتبار سے بہت عمیق اور دقیق ہے۔ اسی لئے سید صاحب نے "غزل الغزلات" کے حاشیہ میں بہت سے اشعار کے رموز و کنایات کی تشریح کر دی ہے اور بعض مقامات پر ان کے مذاق آشنا مرتبِ دیوان نے بھی حاشیہ آرائی کی ہے۔

سید سلیمان ندوی کے عارفانہ کلام کا جو نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اربابِ نظر کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہاں معرفت اور مسائلِ تصوف کا بیان محض برائے شعر گفتن نہیں ہے۔ بلکہ شاعر نے اپنے دل کی دنیا میں ڈوب کر یہ اشعار کہے ہیں۔ ان میں جو سوز و گداز، جذبات کی شدت و فراوانی اور صداقت و واقعیت موجود ہے۔ وہ ان کے نکتہ چینوں کو بھی اعترافِ حقیقت پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر شاعری جذبات کی بہترین ترجمانی کا نام ہے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحب کا عہدِ آخر کا کلام اس کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔

دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی

سید صاحب نے غزل کے علاوہ نعت، قومی نظمیں، مراثی، قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں۔ جن سے ان کی قدرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۲۹ء میں آخری بار سفرِ حج کے موقع پر جب وہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو روضۂ اطہر کے روبرو پہنچتے ہی ان کا چشمۂ حبِ رسول نعت کی شکل میں اُبل پڑا۔ چوں کہ وہ نرے شاعر نہ تھے، بلکہ مقامِ نبوت کے مرتبہ شناس اور اوصاف و خصائص نبوت کے عارف و امین بھی تھے۔ اپنی زندگی کی بہترین صلاحیتیں سیرتِ نبوی کی خدمت اور اس کے احیاء و اشاعت میں صرف کر دیں، اس لئے ان کی نعتوں میں شاعری سے زیادہ حقیقت کا بیان ہے۔ مدینہ طیبہ کی حاضری کے وقت بارگاہِ رسالت میں جو نعت پیش کی اس کے چند شعر یہ ہیں

آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے — مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو — خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اے زائرِ بیت نبوی یاد رہے یہ
بے قاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے

کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی
محبوبِ خدا ہے وہ جو محبوبِ نبی ہے

اور پھر جب حج سے فارغ ہوکر وطن واپس آرہے تھے۔ تو خسرو جہاز پر ایک دوسری نعت لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

عشقِ نبوی دردِ معاصی کی دوا ہے
ظلمت کدۂ دہر میں وہ شمعِ ہدیٰ ہے

آمد تری اے ابرِ کرم رونقِ عالم
تیرے ہی لئے گلشنِ ہستی یہ بنا ہے

فرمانِ دو عالم تری توقیع سے نافذ
تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے

لے جائے گا رہرو کو وہ منزل سے بہت دور
جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

ایک زمانے تک صنفِ مرثیہ واقعاتِ کربلا کے ساتھ مخصوص و محدود رہی۔ مولانا حالی نے اپنے شہرۂ آفاق مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ جہاں اردو شاعری کے بہت سے دوسرے نقائص پر ضربِ کاری لگائی۔ وہیں اس بات پر بھی زور دیا کہ مرثیہ کو شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس میں مشاہیرِ قوم اور اربابِ کمال کی موت پر بھی ان کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر کیا جائے[1] چنانچہ حالی نے مرثیہ غالب لکھکر شخصی مراثی کے سرمایے میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ سید صاحب نے بھی اپنے استاذ علامہ شبلی کی وفات پر نہایت دلدوز اور درد انگیز مرثیہ کہا۔ یہ مرثیہ ترکیب بند میں ہے اور سات بندوں اور ۶۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ سید صاحب کو اپنے استاذ سے جو غیر معمولی قلبی محبت اور عقیدت تھی وہ اس کے لفظ لفظ سے تراوش کرتی ہے۔ اس میں ان کے سینہ کا سوز و گداز، قلب کا سوز، محبت و اخلاص اور درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرگیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا مرثیہ غم کا تاج محل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے متاعِ عزتِ پیشیں کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی بٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

جس کے لب کی جو صدا تھی نوحۂ اسلاف تھی
جس کی ہر فریاد بھی صورت درائے کارواں

جس کی اک اک بات تھی روحِ بلالی کی اذاں
جس کی رگ رگ میں تھیں سوزِ درد کی چنگاریاں

جس کے خامہ کی روانی میں نہاں رودِ فرات
جس کے ہر صفحہ کا دامن رشکِ دریائے عماں

[1] حالی: مقدمہ شعر و شاعری ۸۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا فریبِ صبر کھائے غم نصیبِ دلفگار
جس کی دولت لُٹ گئی کب اسکو دل پر اختیار

جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا
پھر دلِ اندوہ گیں کو کس طرح آئے قرار

یاد آئے جب وہ اس کا فقرۂ نا مختتم
"آہ سیرت، آہ سیرت" چھوڑ کر سب کاروبار

پھر نہ کس طرح پر شوری قلبِ مضطرب
کس طرح رک جائے خوں نابِ چشمِ اشکبار

کون اب بتلائے مجھ کو طرزِ اعجاز بیاں
کون پھونکے اب مرے بے جان سے فقروں میں جان

اب پرِ پروازِ معنی کون بخشیگا مجھے
پست مضموں کون پہونچائے گا اب تا آسماں

کون دیکھے گا مرا اب زور بازوئے قلم
کون دیکھے گا مری جولانیٔ طبعِ رواں

کس کے نام کا بناؤں اب میں عنوانِ خطاب
"سیدی" "مولائی"، "استادی"، "غزالی الزماں"

جب یہ مرثیہ معارف نومبر ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، حبیب الرحمٰن خاں شروانی — حمید الدین فراہی اور اکبر آلہ آبادی نے اس کو پڑھکر مرثیہ نگار کی سخنوری اور نوحہ سنجی کی داد دی۔ اکبر نے اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب کو لکھا۔

"نظم پہونچی، نہ صرف آپ کی قابلیت کی شاہد ہے، بلکہ آپ کا دلی جوش ظاہر ہوتا اور دل پر اثر پڑتا ہے

ع مرکزِ امید تھا جو جب وہی جاتا رہا الخ ع اب پرِ پروازِ معنی کون بخشے گا مجھے الخ

ع کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن ع کون دیکھے گا مرا اب زور بازوئے قلم الخ

کیا لاجواب شعر ہیں، معنی اور الفاظ دونوں لحاظ سے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سکونِ خاطر عطا فرمائے[1]

اسی طرح جب ۱۹۱۵ء میں سید صاحب کی پہلی بیوی نے داغِ مفارقت دیا تو دل کے پُر درد نالے اشعار میں ڈھل گئے۔ اپریل ۱۹۱۵ء کے معارف میں "مرگِ یار" کے عنوان سے ۱۴ اشعار کا یہ دردناک مرثیہ شائع ہوا۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

---

[1] قلمی نادر خطوط مشاہیر محفوظہ کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڑھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درد اٹھا تھا کہ مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے　　کیوں رگِ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا
بہ تماشائے جہان خواب پریشاں ہی سہی　　پر یہ کیوں خواب مرے واسطے شب بھر نہ ہوا
کس سے کیجے دلِ شیدا گلۂ تنہائی　　مسندآرا مرے پہلو میں جو دلبر نہ ہوا
حیف اس خون کی قیمت جو مژہ سے ٹپکے　　قطرۂ اشک ہوا گوہرِ احمر نہ ہوا

ڈاکٹر اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء میں سید صاحب کو لکھا تھا۔ "مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں وہ نہایت مقبول ہوئیں۔ غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھیے۔"[لہ] سید صاحب نے اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے شبلی کے رنگ میں متعدد تاریخی نظمیں لکھیں۔ چنانچہ "درسِ مساوات" کے عنوان سے ایک تاریخی نظم میں خلیفہ ہارون الرشید کا درج ذیل واقعہ نظم کیا ہے۔

"ہارون الرشید ایک بار مدینہ گیا۔ شاہزادہ امین و مامون بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہاں اس وقت حضرت انس ابن مالک کا حلقۂ درس حدثنا و اخبرنا کے زمزموں سے گونج رہا تھا۔ خلیفہ کی خواہش ہوئی کہ یہاں آکر اس کے لختِ جگر حدیث کے اس چشمۂ حیواں سے تشنہ کام نہ جائیں۔ چنانچہ اس نے امام مالک کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ میرے لڑکے مجمعِ عام میں جا نہیں سکتے۔ لہٰذا آج "ایوانِ شاہی" میں درسِ حدیث دیں۔

آرزو تھی یہ خلیفہ کو مدینہ جاکر　　جائیں محروم نہ اس در سے مرے لختِ جگر
حکم پہونچا یہ خلافت سے کہ اے ابن انس　　مجمعِ عام میں جا نہیں سکتے میرے پسر
اس لئے آج یہ بہتر ہے کہ تعلیم حدیث　　آپ دیں خاص انھیں ایوانِ شہی میں آکر

امام مالکؒ نے ارشاد فرمایا۔

سُن کے فرمانِ خلافت یہ ارشاد ہوا　　اے خلیفہ تری تعمیل ضروری ہے مگر
ہے یہ علمِ نبوی تیرے ہی گھر کی دولت　　خواہ حرمت اسے دے خواہ اہانت اسے کر

مامون نے امام صاحب کا یہ جواب سن کر ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اچھا ٹھیک ہے آپ تشریف نہ لائیں لیکن

لہ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۲۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب شاہزادے سماعتِ حدیث کے لئے حاضر ہوں تو اس وقت کوئی دوسرا شریکِ درس نہ ہو۔

سُن کے ہارون نے دربارِ امامت کا جواب ― بھیجا پیغام کہ گر آپ نہ آئیں گے اگر
خود یہ شہزادے وہاں درس میں حاضر ہونگے ― مگر اوروں کا نہ ہو بزم میں اس وقت گزر

امام مالک نے اس تجویز کو بھی اسلامی شان مساوات کے خلاف قرار دے کر کمال استغناء سے رد کر دیا۔ اور پوری جرأت سے خلیفہ کو کہلا بھیجا ۔

مالک ابن انس نے اسے کہلا بھیجا ― مرے کاشانے میں ممکن نہیں تمییزِ بشر
درسگہِ خاص نہیں درسگہِ عام ہے یہ ― ہو مساواتِ بشر معنی اسلام ہے یہ"۔

اسی طرح جون ۱۹۱۶ء میں ایک نظم "سر الحیات" کے عنوان سے لکھی، جس میں قوم کی زبان سے مسلمانوں کی غفلت اور ان کے انحطاط کا ذکر کرکے ان کی نشاۃِ ثانیہ کی اصل روح بیان کی ہے۔ اور "چشمۂ حیات" اور "قوتِ بشر" کی نشاندہی کی ہے ۔

اک شور ہے کہ قوم میں اب زندگی نہیں ― شیرازۂ جماعتِ قومی ہے منتشر
قوت نہ بازوؤں میں، نہ سر میں بلندِ فکر ― کچھ اضطرابِ قلب نہ کچھ کاوشِ جگر

اے چارہ گر تغافلِ دیرین سے ہوشیار ― معلوم ہے نہ رمزِ حیاتِ امم مگر
مانا کہ آبلوں سے ہیں تلوے بھرے ہوئے ― چرکے لگے ہوئے ہیں بہت جسم زار پر
یہ سب بجا پر ہے ضروری بقائے روح ― لازم ہے فکرِ زخم جگر سب سے بیشتر
وہ جذبِ مذہبی ہے وہ ملت کا جوش ہے ― جو چشمۂ حیات ہے اور قوتِ بشر
پیدا ہو جب وہ آگ کے شعلہ کی شکل میں ― ہو جائے جب وہ برق کی صورت میں جلوہ گر

ان شست بازوؤں میں پہاڑوں کا زور ہو
ان مضمحل قویٰ میں ہو طوفان کا اثر

رولٹ بل کے خلاف جس زمانے میں پورے ہندوستان میں بے چینی اور اضطراب بپا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا۔ سید صاحب نے "انڈمنٹی بل اور رولٹ بل" کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی تھی جو اکتوبر ۱۹۱۹ء کے صبح امید لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد جلیانوالا باغ کا حادثۂ خونیں پیش آیا۔ سید صاحب مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ مجلس خلافت کا وفد لے کر انگلستان گئے۔ وہاں سے واپسی میں جہاز کے عرشہ سے بحر عرب کا منظر دیکھ کر ان کے جذبات میں طلاطم پیدا ہوگیا اور پندرہ سولہ اشعار کی ایک دلکش نظم معرضِ وجود میں آگئی۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں ۔

بحر العرب! مبارک تیری روانیاں ہیں — سطروں میں تیری لکھی اگلی کہانیاں ہیں
ہر سمت تو ہی تو ہے تیری ہی گفتگو ہے — ہاں قطرہ قطرہ تیرا، سازِ انا دہو ہے
کیا تیرے جزو کل میں وحدت کا اک سماں ہے — تو یا محیط ہستی یا سایۂ خدا ہے

جولائی ۱۹۳۳ء میں سید صاحب راندیر اور سورت کے ایک علمی سفر پر تشریف لے گئے اور جب وہاں سے بھروچ جا رہے تھے تو راستہ میں دریائے نربدا کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور ان کو اپنے کاروانِ رفتہ کی یاد آئی ۔ اور اسی عنوان سے ایک نظم کہہ ڈالی۔ جس کے شروع میں کہتے ہیں:۔

نربدا! اے نربدا! اے جادۂ بحرِ عرب — گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحرِ عرب
ہاں گذشتہ کارواں کا تو نشانِ راہ ہے — ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز — تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو — چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو
اے بھروچ! اے خاتمِ انگشت رودِ نربدا — عہدِ ماضی کی تری عزت رہے قائم سدا

رباعیات و قطعات میں بھی سید صاحب کی فکرِ سخن نے اپنی جولانی دکھائی ہے۔ چنانچہ ۱۷ مئی ۱۹۱۰ء کو جب علامہ شبلی کا مشہور حادثہ پیش آیا تو اس پر مولانا حالی نواب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علی حسن خاں، خواجہ عزیز الدین، اقبال سہیل اور مولانا عبدالسلام ندوی نے متعدد رباعیاں کہیں۔ جن میں اس واقعہ کی عجیب عجیب لطیف شاعرانہ توجیہات کی گئی تھیں۔ علامہ مرحوم نے یہ تمام رباعیاں سید صاحب کو دیدیں، جنھوں نے ان کو ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں شائع کر دیا۔ اسی سلسلہ میں خود سید صاحب نے بھی اپنے محسن و مربی کے اس عظیم المیہ پر دلی تاثرات شعری سانچے میں ڈھالے تھے۔ خود رقمطراز ہیں:۔

"خاکسار شاعر نہیں۔ اس پر بھی کچھ کہا تھا۔ جس کو ادباً با مولانا کی تنقید کے ڈر سے پیش نہیں کیا۔ اسی مہینہ "موازنۂ انیس و دبیر" شائع ہوئی تھی۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا

تنقید مراثی کے صلہ میں اُستاذ　　دربارِ حسینی نے شہادت بخشی
پرسہ سے ابھی کام تھا لینا باقی　　اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی"

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نکاح کے موقعہ پر سید صاحب نے جو قطعات موزوں کیئے تھے ان میں سے دو قطعات ملاحظہ فرمائیں:۔

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد　　نوشاہ بنیں گے آج عبدالماجد
اللہ کرے وہ دن بھی جلد آجائے　　بن جائیں گے وہ جب کسی کے والد ماجد

دنیا پہ کرے جو غور کوئی تھوڑا　　پائے گا ہر ایک شے کو جوڑا جوڑا
دعویٰ تھا مرے دوست کو یکتائی کا　　اللہ نے اب غرور ان کا توڑا

خاتمہ کلام | سید صاحب کے اعلیٰ ذوق سخن اور عربی و فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں قدرتِ کلام کے تمام تر اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے علم و ادب اور تحقیق و تصنیف کے میدان میں جو روشن اور لافانی کارنامے انجام دیئے ہیں، ان کے مقابلہ میں ان کی شاعری کم مایہ اور فرو تر ہے۔ اگر سید صاحب صرف شاعری کی طرف توجہ کرتے تو وہ اپنے عہد کے آتش و حسرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ سہی، امیر مینائی اور جلال ضرور ثابت ہوتے لیکن بصورتِ موجودہ سیرت النبی، ارض القرآن خیام" عرب و ہند کے تعلقات اور حیاتِ شبلی کی رنگا رنگ نقش آرائیوں کے سامنے "ارمغان سلیمان" کی چاندنی بے کیف اور گہن آلود محسوس ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب جس درجہ کے مصنف و محقق اور ادیب تھے۔ اس مرتبہ کے شاعر نہ تھے۔ اور نہ وہ خود اس درجہ کے شاعر بننا ہی چاہتے تھے۔ وہ صرف اس حد تک شاعر تھے کہ جب کبھی ان کا جی چاہتا یا ان کے واردات قلبی اُمنڈ پڑتے یا کسی واقعہ اور خبر سے متاثر ہو جاتے تو اپنی دلی کیفیات کو شاعری کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ اور بس۔ غالباً یہی سبب ہے کہ نہ تو خود سید صاحب نے زندگی بھر کبھی اپنی شاعری کو اہمیت دی اور نہ دوسرے سوانح نگاروں اور نقادوں نے ہی اس کو لائقِ اعتنا خیال کیا۔

الفخری

الفخری کا شمار اسلام کی مستند تاریخوں میں ہے، مختصر مگر جامع۔ اس میں ایسی خصوصیات ہیں جو دوسری تاریخی کتابوں میں نہیں ملتی۔ مصنف "محمد بن علی طباطبا" نے تاریخ الفخری کے دو حصے کیے ہیں۔ ایک سیاست اور اصول حکمرانی۔ اور دوسرے دول اسلامیہ کی مختصر تاریخ جس میں ہر خلیفہ کے حالات کے ساتھ اس کے وزراء کا مفصل تذکرہ ہے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے لے کر آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک حالات بیان کئے گئے ہیں۔ مترجم مولوی محمود علی خاں بھوپالی مرحوم۔

متوسط تقطیع ۲۰×۲۶/۸ سائز قیمت مجلد:۔ اٹھارہ روپے پچھتر پیسے

ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶

© rasailojaraid.com